رضوان اللہ

البیان: خصائص و امتیازات

(۳)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

[اس مضمون کی ۱۲ اقساط اکتوبر ۲۰۱۸ء اور دسمبر ۲۰۱۸ء کے شماروں میں سلسلہ وار شائع ہوئی ہیں۔ اس سلسلے کو دوبارہ شروع کیا جا رہا ہے۔ ادارہ]

سیاق و سباق

معنی کی تعیین میں چوتھی اہم ترین چیز سیاق و سباق ہے۔ لفظ کو اس سے کاٹ لیا جائے یا کسی وجہ سے یہ نظروں سے اوجھل رہ جائے تو اس کا مرادی معنی معلوم کرنا انتہائی مشکل ہو جاتا، بلکہ بعض اوقات کچھ سے کچھ اور ہو جاتا ہے۔ ''البیان'' کے ترجمے کو شاید اس لحاظ سے کم یاب کہا جا سکے کہ اس میں سیاق و سباق کی رعایت پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ہم ذیل میں چند عنوانات کے تحت کچھ مثالیں عرض کرتے ہیں جن سے ہماری اس بات کی بخوبی وضاحت ہو سکے گی:

۱۔ مشترک لفظ کے معنی کی تعیین

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ.(البقرہ۲:۲۲۸)

''اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، وہ اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار کرائیں۔''

یہاں 'قُرُوْٓءٍ' کا ایک مشترک لفظ آیا ہے، یعنی یہ حیض اور طہر، دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ''البیان''

میں اس سے مراد حیض لیا گیا ہے اور اس کی وجہ جس طرح یہ ہے کہ اس کا اصل معنی ہے ہی حیض، اسے طہر کے لیے تو بس استعمال کر لیا جاتا ہے، اسی طرح اس کے دو مزید وجوہ سیاق وسباق میں بھی پائے جاتے ہیں: ایک یہ کہ اصل مسئلہ یہاں اس بات کو متعین کرنے کا ہے کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں اور اس کا فیصلہ حیض سے ہوتا ہے نہ کہ طہر سے۔ دوسرے یہ کہ یہاں توقف کی مدت مقرر کی گئی ہے اور یہ بھی حیض سے بالکل متعین ہو جاتی ہے کہ اس کی ابتدا کے بارے میں کوئی شک اور شبہ نہیں ہوتا۔

۲۔ جامع لفظ کی تخصیص

عربی زبان میں بعض الفاظ ایک جامع مفہوم کے حامل ہوتے ہیں اور وہ اپنی اس جامعیت کو برقرار رکھتے ہوئے کسی ایک پہلو سے تخصیص میں بھی چلے جاتے ہیں۔ 'تقوٰی' کا لفظ اس کی ایک اچھی مثال ہے[۱۵]۔ اس کا جامع مفہوم تو ''بچنا'' ہے، مگر مختلف سیاق میں یہ ''بچنا'' اپنے مختلف پہلوؤں کو بیان کر رہا ہوتا ہے:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ. (البقرہ ۲: ۲۱)	''تم اپنے اُس پروردگار کی بندگی کرو لوگو، جس نے تمھیں پیدا کیا ہے اور تم سے پہلوں کو بھی، اِس لیے کہ تم (اُس کے عذاب سے) بچے رہو۔''

اس آیت میں ' تَتَّقُوْنَ' کا لفظ آیا ہے جس کا مطلب ہے کہ تم بچے رہو۔ لیکن دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ ''البیان'' میں اس سے ''اُس کے عذاب سے بچنا'' مراد لیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ لفظ کے جامع مفہوم میں اس تخصیص کے پیدا ہو جانے کی دلیل کلام ہی میں موجود آیت ۲۴ کے یہ الفاظ ہیں: 'فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ'۔ یہ الفاظ اس معاملے میں بالکل واضح ہیں کہ وہ تخصیص اصل میں جہنم کی آگ کے عذاب سے بچنا ہے۔

وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ. (البقرہ ۲: ۱۷۹)	''اور تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے، عقل والو، تاکہ تم حدود الٰہی کی پابندی کرتے رہو۔''

یہاں خدا کی طرف سے حدود کا بیان ہو رہا ہے کہ اگر کسی شخص کو قتل کر دیا جائے تو قتل کرنے والے سے

۱۵۔ اس کی ایک مثال لفظ 'النساء' بھی ہے جس کا جامع مفہوم عورت ہے۔ اب اس سے مراد ایک اجنبی عورت بھی ہو سکتی ہے اور کسی کی بیوی، بیٹی اور اس کی ماں بھی۔ البقرہ ۲: ۲۳۱، ۲۳۵۔ النساء ۴: ۳۔ الاعراف ۷: ۱۴۱۔ اور ایسا ہی معاملہ لفظ 'اٰیة' کا بھی ہے۔

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

اُس کا قصاص ضرور لیا جائے۔ آخر میں فرمایا ہے کہ اس میں تمھارے لیے زندگی ہے اور اس کا حکم اس لیے دیا گیا ہے: 'لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ'۔ تاکہ تم بچو۔ ظاہر ہے، بیان حدود کے سیاق میں اس سے جان کی حرمت اور اس جیسی خدا کی مقرر حدوں کو پھلانگنے سے بچنا ہی مراد ہے، اور ''البیان'' میں اسی لیے ''حدود الٰہی کی پابندی کرتے رہو'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔[16]

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ. (البقرہ ۲:۶۶)

''اِس طرح اُن کی اُس بستی کو، (جس میں اُنھوں نے سبت کی بے حرمتی کی تھی)، ہم نے اُس کے گردو پیش کے لیے ایک نمونۂ عبرت اور خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ایک ذریعۂ نصیحت بنا دیا۔''

اس مقام پر بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ انھوں نے سبت کے معاملے میں خدا کے حکم کی بے حرمتی کی تھی۔ اس پر خدا نے انھیں عذاب میں مبتلا کیا اور فرمایا کہ ہم نے گردو پیش کے لوگوں کے لیے اُن کی بستی کو عبرت کا نمونہ بنا دیا 'وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ'۔ اور نصیحت بنا دیا ڈرنے والوں کے لیے۔ ''البیان'' میں یہاں 'تقوٰی' کے جامع مفہوم کی تخصیص بیان کرتے ہوئے اس سے خدا سے ڈرنا مراد لیا گیا ہے اور ظاہر ہے اس کی وجہ سیاق و سباق میں آنے والی یہ بات ہے کہ یہ جرم خدا کے مقابلے میں سرکشی کے نتیجے میں سرزد ہوا تھا، اس لیے اِس کی سزا اُنھی لوگوں کے لیے نصیحت بن سکتی ہے جو سرکش ہونے کے بجائے اُس سے حد درجہ ڈرنے والے ہوں۔

یہاں ضمنی طور پر یہ بات سامنے رہنی چاہیے کہ مذکورہ آیت کی طرح جب 'تقوٰی' کا ترجمہ ''ڈرنا'' کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب بھی اصل میں ''بچنا'' ہی ہوتا ہے۔ یعنی، ''اللہ سے ڈرو'' کا مطلب ہو گا کہ اُس کے عذاب سے اور اُس کے بیان کردہ حدود کو پھلانگنے سے بچنے کا التزام کرو۔ اسی طرح جب یہ کہا جائے کہ ''خدا سے ڈرو اور یہ کام نہ کرو''، تو اس کا مطلب بھی یہی ہو گا کہ خدا سے ڈرتے ہوئے اس کام کا ارتکاب کرنے سے بچو۔

۳۔ متعدد معانی میں سے ایک کی تعیین

قرآن میں بہت سے الفاظ مستقل طور پر ایک سے زائد معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ کس مقام پر ان میں

۱۶۔ یاد رہے کہ ''حدود کی پابندی کرنا'' اور ''انھیں پھلانگنے سے بچنا'' یہ اصل میں ایک ہی بات کو ادا کرنے کے دو مختلف اسالیب ہیں۔

سے کون سا معنی مراد لیا گیا ہے، اس معاملے میں کلام کا سیاق وسباق بنیادی اور فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ جیسا کہ لفظ 'مَثَل' کا قرآن میں استعمال:

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا. (الجمعہ ۶۲: ۵)

''جن لوگوں پر تورات لادی گئی، پھر اُنھوں نے اُس کو نہیں اٹھایا، اُن کی مثال تو اُس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔''

'مَثَل' کا لفظ اصل میں کسی شے کو دوسری کے ساتھ مشابہ اور اُس جیسا قرار دینے کے لیے آتا ہے۔ یہاں 'الْحِمَارِ' کی صورت میں یہود کی قوم کا مشبہ بہ چونکہ موجود ہے، اس لیے واضح ہے کہ یہاں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے اور ''البیان'' میں اسی لیے اس کا ترجمہ ''اُن کی مثال اُس گدھے کی سی ہے'' کے لفظوں میں کیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ. (الزمر ۳۹: ۲۷)

''ہم نے اِس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی تمثیلیں بیان کر دی ہیں، اِس لیے کہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تمثیل اپنی حقیقت میں تشبیہ ہی کی ایک صورت ہے، مگر اس میں کسی چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ نہیں دی جاتی، بلکہ کسی حقیقت کو دوسری حقیقت یا صورت واقعہ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ آیت ۲۸ میں شرک و توحید کے درمیان میں پائے جانے والے فرق کو سمجھانے کے لیے دو غلاموں کے بارے میں ایک حقیقت بیان ہوئی ہے کہ ان میں سے پہلے کے کئی آقا ہیں جو آپس میں کش مکش رکھتے ہیں اور دوسرا وہ ہے جو پورا کا پورا ایک ہی شخص کی ملکیت ہے۔ یہ ایک حقیقت کی دوسری حقیقت کے ساتھ تشبیہ ہے، چنانچہ ''البیان'' میں 'مَثَل' کو ادا کرنے کے لیے ''تمثیل'' کا لفظ لایا گیا ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ. (الفرقان ۲۵: ۹)

''دیکھو، (اے پیغمبر)، یہ تمھاری نسبت کیسی کیسی باتیں بنا رہے ہیں۔''

بعض اوقات کسی دوسرے شخص کے لیے بری بری مثالیں دی جاتی ہیں اور غور کیا جائے تو اس وقت 'مَثَل' کا مطلب اُس شخص کے بارے میں باتیں بنانا ہوتا ہے۔ آیت ۷ اور ۸ میں دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ منکرین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا کرتے کہ یہ کیسا آدمی ہے کہ اپنے آپ کو رسول کہتا ہے اور ہماری طرح کھانا کھاتا اور اپنی ضرورتوں کے لیے بازاروں میں چلتا پھرتا ہے اور کہتے کہ تم لوگ تو ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے

ہو۔ سواس آیت کا یہی سیاق وسباق ہے کہ ''البیان'' میں 'اَلْاَمْثَالَ' کا ترجمہ کرنے کے لیے ''باتیں بنانا'' کا محاورہ لایا گیا ہے۔

وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا. (الفرقان ۲۵: ۳۳)

''یہ لوگ جو اعتراض بھی تمھارے پاس لے کر آئیں گے، اُس کا ٹھیک جواب اور اس کی بہترین توجیہ ہم تمھیں بتادیں گے۔''

باتیں بنانے ہی کا ایک شدید تر پہلو یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات یہ لفظ اعتراض کرنے اور نکتہ چینی کرنے کے معنی میں چلا جاتا ہے۔ پچھلی آیات میں منکرین کے اٹھائے ہوئے تمام اعتراضات کا جواب دیا ہے اور اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ: 'وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ'۔ ظاہر ہے، اس سیاق میں اب اس کا ترجمہ ''اعتراض'' ہی کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ ''البیان'' میں ایسا کیا بھی گیا ہے۔

فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ. (الزخرف ۴۳: ۵۶)

''اور اُن سب کو غرق کر دیا اور اُن کو ایک قصۂ ماضی اور دوسروں کے لیے نمونۂ عبرت بنا دیا۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جب ہم کسی تنبیہ کا ذکر کرنے کے بعد کہیں کہ اس چیز کو ہم نے تمھارے لیے مثال بنادیا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اسے عبرت کا سامان بنادیا ہے۔ پچھلی آیات میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی آل فرعون کی طرف بعثت اور اس کے جواب میں اُن کے انکار اور سرکشی کا بیان کرتے ہوئے آخر میں فرمایا ہے کہ انھوں نے ہمیں غضب ناک کر دیا تو ہم نے اُن سے انتقام لیا اور اُن سب کو غرق کر دیا اور اُن کو ایک قصۂ ماضی بنا دیا 'وَمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ'۔ اور دوسروں کے لیے عبرت بنادیا۔ واضح سی بات ہے کہ اس سیاق وسباق میں 'مَثَل' کا ترجمہ یہی بنتا ہے۔

ہم نے 'مَثَل' کو یہاں محض مثال کے طور پر بیان کیا ہے، ورنہ قرآن میں بہت سے الفاظ ہیں جو متعدد معانی رکھتے اور سیاق وسباق کی رعایت سے اپنے معنی کی تعیین کرتے ہیں، جیسا کہ 'سوال' کا لفظ جو تحقیق، اعتراض اور استہزا، ان سب معنوں میں آیا ہے۔ 'قل' کہہ دینے، پوچھنے، سنادینے اور اعلان کر دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ 'زوج' بیوی، جوڑے، جوڑے کے ایک فرد اور انواع واقسام کے معنوں میں اور 'حُکم' کا لفظ فیصلہ کرنے کی صلاحیت، فیصلہ اور حکومت، ان سب معنوں میں آیا ہے۔

۴۔ لفظ کے خاص استعمال سے پیدا ہونے والے معانی

بعض الفاظ قرآن میں اپنے عام طور پر رائج مفہوم سے ہٹ کر کسی خاص مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں، مگر مترجمین کی اُن تک رسائی نہ ہو سکنے اور سیاق وسباق کو بالکلیہ نظر انداز کر دینے کے باعث ترجمہ میں کچھ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ''البیان'' میں کیا گیا ذیل کی چند آیتوں کا ترجمہ ہماری اس بات کو سمجھنے میں کافی معاون ہو سکتا ہے:

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ. (العلق ۹۶:۱)

''اِنھیں پڑھ کر سناؤ (اے پیغمبر)، اپنے اُس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے۔''

'قراءۃ' عربی زبان میں پڑھنے ہی کے لیے آتا ہے، مگر بعض اوقات کسی خاص ماحول میں اس ''پڑھنے'' کو اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ اس کا مفہوم ''پڑھ کر سنا دینے'' کا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک استاد طالب علموں کے سامنے اپنے معاون سے کہے: ''پڑھو۔'' ظاہر ہے اس کا مطلب اب پڑھنے کا نہیں، بلکہ طلبا کے سامنے پڑھ کر سنا دینے کا ہو جائے گا۔ سیاق وسباق اس بات پر دال ہے کہ زیر نظر آیت میں یہ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انذار کے پہلو سے ہدایت دی جا رہی ہے کہ اپنے اُس پروردگار کی طرف سے قرآن کو پڑھ کر سنا دیں جو ان لوگوں کا خالق ہی نہیں، بلکہ ان پر اس قدر کریم بھی ہے کہ اُس نے اپنی ہدایت کو لکھ کر دینے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ اس روشنی میں 'اقراء' کی صحیح تالیف اب یہی بنتی ہے: 'اقراءہ علیھم'، یعنی اے پیغمبر انھیں پڑھ کر سنا دو، چنانچہ ''البیان'' میں موقع کلام کی اسی مناسبت سے اس کا ترجمہ ''انھیں پڑھ کر سناؤ'' کیا گیا ہے۔[۱۷]

یہاں ضمنی طور پر یہ بات بھی سامنے رہے کہ اس سلسلے میں جو روایت[۱۸] بیان کی جاتی ہے، وہ اگر اپنی تمام تفصیلات میں صحیح ہے تو وہ بھی قرآن کے بیان کردہ اسی مفہوم کی روشنی میں کھل سکتی ہے۔ وگرنہ اس کے بارے میں بہت سے سوالات سر اٹھائے رکھتے ہیں، جیسا کہ یہ سوال کہ آپ پر وحی زبانی صورت میں اتری تھی یا لکھی ہوئی صورت میں؟ آپ پڑھ لکھ سکتے تھے یا آپ پڑھنا لکھنا بالکل نہ جانتے تھے؟ جبریل کے بھینچنے سے

۱۷۔ یاد رہے 'قراءۃ' کا یہ خاص مفہوم اور بھی کئی مقامات پر آیا ہے، جیسا کہ الاعراف ۷: ۲۰۴ اور بنی اسرائیل ۱۷: ۴۵ میں۔

۱۸۔ صحیح بخاری، رقم ۳۔

www.javedahmadghamidi.com

اگر آپ میں پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی تو کیا اس واقعے کے بعد بھی یہ صلاحیت آپ میں موجود رہی تھی؟ اور اسی طرح کے مزید سوالات۔ مذکورہ تالیف کی روشنی میں اس روایت کا واضح مطلب اب یہ سامنے آتا ہے کہ سیدنا جبریل نے جب لوگوں کے سامنے اس پیغام کو پڑھ کر سنا دینے کے لیے کہا تو آپ نے 'ما انا بقاری' کہہ کر اپنے ہمت و حوصلہ کے معاملے میں ایک عذر پیش کیا۔ اس پر جبریل نے آپ کو اپنے ساتھ لگا کر بھینچا تو اس کے نتیجے میں جس طرح آپ کو اُن سے حد درجہ موانست پیدا ہوئی، اسی طرح اپنے کام کے لیے درکار ہمت اور حوصلہ بھی حاصل ہو گیا۔

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآٮِٕهِمۡ ۚ فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآٮِٕهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ. (البقرہ ۲: ۳۳)

''فرمایا: آدم، تم اِن ہستیوں کے نام اِنھیں بتاؤ۔ پھر جب اُس نے اُن کا تعارف اُنھیں کرا دیا تو فرمایا: میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہوں۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اصل میں 'اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآٮِٕهِمۡ' کے الفاظ آئے ہیں اور ان کا رائج مطلب ہے کہ انھیں ان کے نام بتاؤ۔ بعض اوقات انھیں ایک خاص طریقے سے استعمال کیا جاتا ہے اور اب ان کا مطلب ''نام بتا دینے'' سے بڑھ کر ''تعارف کرا دینے'' کا ہو جاتا ہے۔ ہماری زبان میں بھی ان لفظوں کا یہ خاص استعمال موجود ہے، جیسا کہ ہم کسی شخصیت سے متعارف ہونا چاہیں اور مجلس میں موجود اُس کے دوست سے کہیں: ''بھئی، ان کا نام تو بتائیے۔'' اس آیت میں بھی ان کا یہی مفہوم مراد ہے اور دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس پر سیاق و سباق کی دلالت بھی بالکل واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے اس استفسار کے جواب میں کہ جب انسان کو زمین کے اختیارات دیے جائیں گے تو وہ اس میں خون ریزی اور فساد کرے گا، حضرت آدم کو اُن کی اپنی اولاد میں سے کچھ ہستیوں[19] کے نام بتائے ہیں اور اس کے بعد فرمایا ہے: 'يٰٓاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآٮِٕهِمۡ'۔ آدم، انھیں بھی ان کا تعارف کراؤ۔ بلکہ ان الفاظ کا ترجمہ اگر ''نام بتاؤ'' کیا جائے تو اس میں فرشتوں کے مذکورہ سوال کا کوئی جواب ملنا تو بہت دور کی بات، مزید یہ سوال بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر نام صرف آدم کو بتائے تھے تو فرشتوں سے اس کے بارے میں سوال کیوں

19۔ 'اسما' پر الف لام عہد کا ہے، اس لیے یہ کچھ خاص نام ہیں۔ ان کے لیے بعد میں جو ضمیریں اور اشارے آئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاص نام ذوی العقول ہستیوں کے ہیں۔ فرشتوں کے سوال اور آدم کے جواب میں مناسبت کا لحاظ رہے تو ماننا پڑتا ہے کہ وہ خاص ہستیاں بہر حال، اولاد آدم میں سے ہیں۔

پوچھا؟اور پھر آدم سے اُن کے سامنے یہ کیوں کہا کہ یہ نہیں بتا سکتے تو پھر تمھی یہ نام بتادو؟ ''تعارف کراؤ'' ترجمہ کریں تو یہ تمام سوالات ختم ہو جاتے ہیں۔ فرشتوں کے ہاں انسان کو اختیار دینے پر ایک اندیشہ پیدا ہوا تھا، اس کے جواب میں خدا نے آدم کو اُن کی اپنی اولاد میں سے کچھ بزرگ اور معتبر ہستیوں کا تعارف کرایا اور اس کے بعد ان سے کہا کہ فرشتوں کے سامنے ان کا تعارف کرادیں تاکہ یہ بھی جان لیں کہ اگر انسانوں میں فسادی پیدا ہوں گے تو اِنھی میں سے خدا پرست اور اُس کی حدود کا لحاظ رکھنے والے بھی ضرور پیدا ہوں گے۔

۵۔ فعل کے مختلف استعمالات

قرآن میں فعل سے متعلق بعض مفاہیم کو ادا کرنے کے لیے واضح طور پر کچھ الفاظ لائے جاتے ہیں، جیسا کہ حق، ارادہ، زعم اور استطاعت وغیرہ۔ لیکن بعض اوقات فعل کو اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ اس کے اصل معنی میں یہ تفصیلات خود سے شامل ہو جاتی ہیں اور انھیں سمجھنے میں بھی فیصلہ کن حیثیت اُن کے سیاق و سباق کو حاصل ہوتی ہے۔ ان استعمالات کی ہم ذیل میں کچھ مثالیں عرض کرتے ہیں، جیسا کہ مثال کے طور پر، فعل سے صرف اُس کا معنی نہیں، بلکہ اُس کا حقیقی اور کامل معنی مراد ہونا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا.(البقرہ۲:۱۰۴)	''ایمان والو، (تم بارگاہِ رسالت میں بیٹھو تو) 'رَاعِنَا' نہ کہا کرو، 'انْظُرْنَا' کہا کرو اور (جو کچھ کہا جائے، اُسے) توجہ سے سنو۔''

www.javedahmadghamidi.com

اس سیاق میں مسلمانوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے خلاف یہود کی شرارتوں کے بارے میں متنبہ کیا جا رہا ہے جو دل کی بھڑاس نکالنے اور آں حضرت کی توہین کرنے کے لیے وہ کیا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک شرارت یہ تھی کہ وہ 'رَاعِنَا' کے لفظ کو جو کسی بات کو دوبارہ سے سننے کے لیے بولا جاتا تھا، اس طرح سے ادا کرتے کہ اس کا معنی بالکل تبدیل ہو کر رہ جاتا۔ چنانچہ زیر نظر آیت میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ اول تو اسے چھوڑ کر دوسرا لفظ اختیار کرلیں اور دوسرے یہ کہ 'وَاسْمَعُوْا'۔ وہ آپ کی بات کو بہت زیادہ توجہ سے سنیں تاکہ دوبارہ سننے کی سرے سے نوبت ہی نہ آئے۔ گویا 'اسمعوا' فعل کہ جس کا سادہ مطلب ''سنو'' ہے، یہاں اُس کی حقیقت مراد ہے اور یہی وجہ ہے کہ ''البیان'' میں ''توجہ سے سنو'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَیَكْفُرُوْنَ	''اور جب ان سے اصرار کیا جاتا ہے کہ اُس چیز کو مان لو جو اللہ نے اتاری ہے تو جواب دیتے ہیں کہ

بِمَا وَرَآءَهٗ.(البقرہ۲:۹۱)

"ہم تو اُسے ہی مانتے ہیں جو ہم پر اترا ہے اور اس طرح جو کچھ اُس کے علاوہ ہے، اُس کا صاف انکار دیتے ہیں۔"

یہود کو قرآن مجید کی طرف دعوت دی جاتی تو وہ اس کے جواب میں کہتے کہ جہاں تک ماننے کی بات ہے تو ہم تورات کو مانتے ہی ہیں۔ گویا اُن کی مراد یہ ہوتی کہ وہ اس کے بعد اب کسی اور کتاب کو ماننا اپنے لیے ضروری نہیں سمجھتے۔ ظاہر ہے، ان کا یہ کہنا تورات کے سوا ہر چیز کا مکمل طور پر انکار کر دینا تھا، چنانچہ انکار کے اس کامل مفہوم کا لحاظ کرتے ہوئے 'یَکْفُرُوْنَ' کا ترجمہ "صاف انکار کر دیتے ہیں" کیا گیا ہے۔

وَلَا یُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَکِّیْهِمْ ص وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ.(آل عمران۳:۷۷)

"اور اللہ قیامت کے دن نہ اُن سے بات کرے گا، نہ اُن کی طرف نگاہ التفات سے دیکھے گا اور نہ اُنھیں (گناہوں سے) پاک کرے گا، بلکہ وہاں اُن کے لیے ایک دردناک سزا ہے۔"

جو لوگ خدا کے عہد اور اپنی قسموں کو دنیا کی تھوڑی قیمت پر بیچ دیتے ہیں، یہ اصل میں آخرت کی بے توقیری اور خدا کی بے قدری ہے۔ چنانچہ ان کے پہلے رویے پر فرمایا ہے: اُن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور دوسرے پر فرمایا ہے کہ وہ اُس دن اُن سے بات نہ کرے گا اور نہ اُن کی طرف دیکھے گا۔ اب عمل اور جزا کی مشابہت کا اصول سامنے رہے تو بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں 'یکلم' اور 'ینظر' سے مراد ان افعال کے حقیقی اور کامل مفاہیم ہیں جنھیں "البیان" میں یوں ادا کیا گیا ہے: "نہ ان سے بات کرے گا، نہ اُن کی طرف نگاہ التفات سے دیکھے گا۔"

کلام میں آنے والے افعال سے اُن کا ابتدائی معنی مراد لینے کی مثال:

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً.(البقرہ۲:۸۰)

"اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ) اِنھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز نہ چھوئے گی، ہاں، گنتی کے چند دنوں کی تکلیف، البتہ ہو سکتی ہے۔"

یہود کے لوگ کہا کرتے تھے کہ وہ خدا کے چہیتے اور محبوب ہیں، اس لیے دوزخ میں نہیں جائیں گے۔ اور بفرض محال، جانا بھی پڑا تو کچھ دنوں کے بعد وہاں سے نکال لیے جائیں گے۔ اُن کی اس بات پر نقد کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ انھوں نے کیا اس بات کا خدا سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟ اور اس کے بعد اگلی آیتوں میں وہ قاعدہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بیان فرمایا ہے جس کے مطابق جرائم کا مسلسل ارتکاب کرنے والوں کو ابدی طور پر ضرور دوزخ میں رہنا ہے۔ اس سیاق میں دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں 'قَالُوْٓا' سے مراد اُن کے زعم باطل کا بیان ہے جو اصل میں لفظ 'قول' کا بالکل ابتدائی مفہوم ہے اور اسی لیے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ''اِنھوں نے دعویٰ کیا ہے۔''

ذیل کی آیت فعل کے ابتدائی اور اُس کے کامل معنی، دونوں کے لیے ایک اچھی مثال ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ. (النساء ۴:۱۳۶) ''ایمان والو، اللہ پر ایمان لاؤ اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ۔''

یہاں 'اٰمَنُوْٓا' کا پہلا فعل اپنے ابتدائی اور دوسرا اس کے کامل مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی، اے لوگو جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہو، تم بالکل ٹھیک طرح سے ایمان لاؤ۔

اسی طرح سیاق وسباق کی رعایت سے فعل میں بعض اوقات استطاعت کا مفہوم شامل ہو جاتا ہے:

وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا. (النساء ۴:۴۲) ''اور وہاں وہ اللہ سے کوئی بات بھی چھپا نہ سکیں گے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فرمایا ہے کہ جو لوگ انکار پر اصرار کرتے رہے اور جنھوں نے رسول اللہ کی نافرمانی کی ہے، اُس دن تمنا کریں گے کہ کاش زمین اُن پر اُن سمیت برابر کر دی جائے، مگر اُن کی یہ خواہش ہر گز پوری نہ ہو سکے گی۔ اسی طرح جب چاہیں گے کہ اپنے جرموں کو خدا سے چھپا لیں تو وہ ایسا بھی ہر گز نہ کر سکیں گے۔ سو موقع کلام اس بات پر دال ہے کہ 'وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ' کے بظاہر سادہ الفاظ میں عدم استطاعت کا مفہوم بالکل واضح طور پر موجود ہے۔

قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات فعل کو اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ اس میں ارادہ کا مفہوم بھی آجاتا ہے:

اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ. (النمل ۲۷:۸۱) ''تم صرف اُنھی کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لانا چاہیں۔ پھر وہی فرماں بردار بھی ہوں گے۔''

پیچھے فرمایا ہے کہ تم اندھے، بہرے اور مردہ صفت لوگوں کو اپنی بات نہیں سنا سکتے: 'اذا ولوا مدبرين'۔ جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں۔ اس کے بعد فرمایا ہے کہ تم اُنھیں ہی سنا سکتے ہو: 'مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا'۔ سو دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ پیٹھ پھیرنے والوں کے مقابلے میں یہ مان لینے والوں کا بیان ہوا ہے جس نے

اس میں اِرادہ کا مفہوم پیدا کر دیا ہے اور اسی وجہ سے ''البیان'' میں اس کا ترجمہ ان لفظوں میں کیا گیا ہے: ''جو ہماری آیتوں پر ایمان لانا چاہیں۔''

اسی طرح کسی بات کا ارادہ اور اس کے بارے میں کوئی فیصلہ ظاہر کرنا ہو تو بعض اوقات اس کے لیے بھی سادہ فعل لایا جاتا ہے اور اس کے بعد یہ موقع کلام ہی ہوتا ہے جو اس کے اندر یہ زائد مفہوم پیدا کر دیتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ. (البقرہ ۲:۶)

''اِس کے بر خلاف جن لوگوں نے (اِس کتاب کو) نہ ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے، اُن کے لیے برابر ہے، تم اُنھیں خبر دار کرو یا نہ کرو، وہ نہ مانیں گے۔''

سیاق وسباق میں موجود چند چیزیں اگر سامنے رہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں 'الَّذِيْنَ كَفَرُوْا' سے مراد وہی لوگ ہیں جنھوں نے انکار کرنے کا حتمی فیصلہ کر رکھا ہے۔ اول، زیر نظر آیت میں ان کے بارے میں بتا دیا گیا ہے کہ ان پر ختم قلوب کیا جا چکا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ محض انکار پر نہیں، بلکہ انکار پر مصر ہو جانے والوں پر کیا جاتا ہے۔ دوم، اس آیت سے پہلے اُن لوگوں کا ذکر کیا ہے جو قرآن کی دعوت کو مان لینے والے ہیں اور اس کے بعد اُن کا تذکرہ ہوا ہے جو مصالحت پسندی کے پردے میں اس کا انکار کر دینے والے ہیں۔ ظاہر ہے، یہاں کفر کرنے والوں سے مراد اب وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو کھلی مخالفت اور پورے دل کے ارادے سے انکار کر دینے والے ہیں۔ سوم، آگے آنے والی تمثیل میں مذکورہ فریق کے بارے میں جو تبصرہ کیا گیا ہے، یعنی یہ اندھے، بہرے اور گونگے ہیں اور ان کی واپسی کا کوئی امکان نہیں ہے، وہ بھی واضح کر دیتا ہے کہ یہ کفر پر اصرار کرنے والا فریق ہی ہیں۔ سو موقع کلام کی یہی دلالت ہے کہ ''البیان'' میں 'كَفَرُوْا' کا ترجمہ محض ''نہ ماننا'' کرنے کے بجائے ''نہ ماننے کا فیصلہ کرنا'' کیا گیا ہے۔

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ. حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ. (الانبیاء ۲۱:۹۵-۹۶)

''ہم نے جس بستی والوں کے لیے (اپنے قانون کے مطابق) ہلاکت مقدر کر رکھی ہے، اُن کے لیے حرام ہے کہ وہ حق کی طرف رجوع کریں، اِس لیے کہ وہ کبھی رجوع نہ کریں گے، یہاں تک کہ وہ وقت آ جائے، جب یاجوج و ماجوج کھول دیے جائیں اور وہ ہر بلندی سے پل پڑیں۔''

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

یہاں بھی 'اَهۡلَكۡنٰهَا' کا مطلب ہلاک کر دینا نہیں، بلکہ ہلاکت کا فیصلہ کر دینا ہے کہ اس بات کو نہ ماننے کی صورت میں جس طرح کلام کے داخل میں ایک طرح کا تناقض اور تضاد پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح 'حتی' سے بیان ہونے والی غایتیں بھی بے محل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ عام طور پر مترجمین اس میں پائے جانے والے فیصلہ کے مفہوم اور دیگر محذوفات کا ادراک نہیں کر پائے، اس لیے اُن کے ہاں ترجمے میں بہت زیادہ اضطراب واقع ہو گیا ہے اور وہ مجبور ہو گئے ہیں کہ 'حرام' کا معنی واجب کریں، یا 'لَا' کو زائد مانیں اور 'يَرۡجِعُوۡنَ' سے دنیا میں لوٹ آنا مراد لے لیں۔[20]

فعل اپنے نتیجے کے لحاظ سے بھی آتا ہے اور اُس وقت بھی سیاق وسباق ہی اصل اور فیصلہ کن ٹھیرتا ہے:

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ۔ (البقرہ ۲:۱۱)

"اور جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ (اپنے اِس رویے سے) تم اِس سرزمین میں فساد نہ پیدا کرو تو جواب میں کہتے ہیں کہ ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں۔"

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس موقع پر بیان ہوا ہے کہ بعض منافقین دور از کار تاویلات کا سہارا لیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا انکار کرتے اور اپنے اس طرز کو اصلاح کی ایک کوشش قرار دیتے تھے۔ دراں حالیکہ، اُس وقت جب اُس سرزمین میں دینونت برپا کر دی گئی تھی، آپ کی دعوت کا انکار کرنے کا مطلب لوگوں کو جنگ وجدال پر آمادہ کرنا اور اس طرح حرث ونسل کو برباد کر دینا تھا۔ چنانچہ انھیں جب یہ کہا جاتا کہ: 'لَا تُفۡسِدُوۡا'۔ تو یہاں 'فساد' سے مراد اصل میں اس فعل کا نتیجہ ہوتا، یعنی اس کا مطلب ہوتا کہ تم جس رویے پر عامل ہو، اس کا لازمی نتیجہ فساد کی صورت میں نکل کر رہے گا، اس لیے اس سے بچ کر رہو۔

یہ آیت بھی اس کی ایک اچھی مثال ہے:

يَسۡـَٔلُهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ۔ (الرحمٰن ۵۵:۲۹)

"زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں، سب (اپنی حاجتیں) اُسی سے مانگتے ہیں۔"

۲۰۔ اگر ارادے اور فیصلے کا یہ مفہوم احاطۂ ادراک میں آجائے تو بہت سی آیات آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہیں، جیسا کہ بچپن میں سیدنا مسیحؑ کا یہ فرمانا کہ اللہ نے مجھے کتاب عطا فرمائی اور مجھے نبی بنایا ہے، اس کا اصل مطلب ہوگا کہ اللہ نے مجھے کتاب دینے اور نبی بنانے کا فیصلہ فرمایا ہے (مریم ۱۹:۳۰)۔

اس میں بھی دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ 'یَسْـَٔلُهٗ' سے مراد یہ نہیں ہے کہ سب لوگ خدا ہی سے مانگتے ہیں کہ یہ بات خلاف واقعہ بھی ہے اور اپنے سیاق وسباق سے بالکل بے جوڑ بھی۔ اسے اس کے نتیجے کے لحاظ سے استعمال کیا گیا ہے کہ وہ جس سے بھی مانگیں، آخر کار پاتے اُسی سے ہیں۔ اور یہ ایسا ہی انداز کلام ہے جیسا کہ ہم دوسروں کے مقابلے میں باپ کی عنایتوں کو بیان کرنا چاہیں اور کہیں کہ بچہ اپنے باپ ہی سے مانگتا ہے۔ مطلب ہو گا کہ اس کے تمام اخراجات کوئی اور نہیں، بلکہ اس کا باپ ہی پورے کرتا ہے۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com